امریکہ میں پاکستان کے فکری رجحانات کی ترجمانی

(ادارہ)

[امریکہ میں اسلام اور مسلمان ممالک کے لیے جو نئی دلچسپیاں ابھر رہی ہیں ان کے زیر اثر ستمبر ۱۹۵۳ء میں پرنسٹن یونیورسٹی اور کانگریس لائبریری کے اہتمام میں مؤتمر الثقافت الاسلامیہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس بین الاقوامی مجلس میں اسلام اور مسلمان ممالک کے فکری رجحانات کی ترجمانی کرنے کے لیے ایسے چیدہ چیدہ اصحاب جمع ہوئے جن میں سے بعض کو امریکی حکومت کی طرف سے سفر کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں اور بعض کو اپنی حکومتوں نے خاص طور پر بھجوایا تھا۔ یہاں ہم اجمالاً پاکستانی نمائندوں کے پیش کردہ خیالات کو سامنے لا رہے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کیسے لوگوں نے آپ کی ترجمانی کی اور کس اسلوب سے ترجمانی کی۔]

(۱)

"پاکستان میں مسلم فکر کے رجحانات" کے عنوان سے جناب مظہر الدین صدیقی صاحب نے جو ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان کے ایک عضو ہیں، خطاب فرمایا۔ آپ کا مطالعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہن پاکستان میں مذہبی تحکم، ادھ کچرے سائنٹفک الحاد، اور کمیونسٹ مادہ پرستی کے رجحانات کے درمیان ایک کشمکش مثلث کی حالت سے گزر رہا ہے۔ مذہبی تحکم پسندی کو وہ تین زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ نظریاتی لحاظ سے یہ رجحان اسلامی قانون کی تعبیر کا قطعی حق دیتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے یہ ایک ایسے جمہوری نظام کا تقاضا کرتا ہے جس میں عام آدمی ایک بار اپنے حکمراں کو عمر بھر کے لیے منتخب کر کے نظامِ اجتماعی پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتا۔ اقتصادی لحاظ سے یہ رجحان معاشرہ کے موجودہ جاگیردارانہ نظام کا حامی ہے اور مزارعین کو مالکانہ حقوق دلوانے پہ تیار نہیں۔ پھر صدیقی صاحب یہ واضح کرتے ہیں کہ اختلافی مذہبی مسائل اور قانونی معاملات میں یہ رجحان حدیث کو معیارِ فیصلہ قرار دیتا ہے۔ یعنی جہاں قرآن کی تعبیر میں کوئی اختلاف ہو لوں سے رفع کرنے کا ذریعہ حدیث کو مانا جاتا ہے۔ یہ چیز متوسط عامی مسلمان کے مقابلے میں اہلِ مذہب کی پوزیشن بڑی مستحکم بنا دیتا ہے، کیونکہ عام لوگ قرآن کو تو آسانی سے

پڑھ سمجھ سکتے ہیں لیکن حدیث کے وسیع ذخیرے پر حاوی نہیں ہو سکتے اور اس لیے وہ معاملات میں فیصلہ کن رائے نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد موصوف حدیث کے ریکارڈ کے ناقابل اعتماد ہونے پر گفتگو کرتے ہیں بہرحال وہ اس بات کا خاص احساس پیش کرتے ہیں کہ حدیث اہل مذہب کی انحصاری ہونے کی بنیاد بن سکتی ہے۔

ہیئت سیاسی میں یہ رجحان صدیقی صاحب کے مطالعہ کے مطابق سارا زور امام (HEAD OF THE STATE) کے منصب کی اہمیت پر صرف کرتا ہے اور اسے تقریباً مختارِ کل بنانا چاہتا ہے۔ باوجود اس کے کہ شورائیت کو لازم ٹھہرایا جاتا ہے، اس رجحان کے علمبردار امام کو اہل شوریٰ کی اکثریت کی رائے کے خلاف جانے کا حق دیتے ہیں۔ یہ رائے ہمارے ہاں شروع سے چلی آرہی ہے کہ صدرِ ریاست کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔

صدیقی صاحب اس چیز پر بھی گرفت فرماتے ہیں کہ قانون سازی کے میدان میں مذہبی تحکم کے رجحان پر قائم ہونے والا مدرسۂ فکر یہ کہتا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ قوانین اور ہدایات حرفِ آخر ہیں اور ہمیشہ کے لیے واجب النفاذ۔ یہ مدرسۂ فکر انسانی معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں سے صرفِ نظر کر کے سوچتا ہے۔ درحقیقت قرآن نے اپنے قوانین کی قطعیت[1] کا سرے سے ادعا ہی نہیں کیا۔ موصوف کی نگاہ میں قرآن کا دینِ کامل تو بس زندگی کے لیے خدا پرستانہ زاویۂ نگاہ اور چند بنیادی اخلاقی قدروں پر مشتمل ہے۔

اب ادھ کچرے سائنس دانوں کی باری آتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ناقص ذہانت کے ساتھ مذہب کو محو کرنے کی تدبیریں سوچتے ہیں، کیونکہ وہ مذہب کو اندھے معتقدات اور اوہام کا مجموعہ سمجھنے کی وجہ سے سائنٹفک زاویۂ نگاہ سے متصادم پاتے ہیں۔ صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ گروہ سرے سے مذہب کو، اور خصوصاً اسلام کو جانتا ہی نہیں۔ ورنہ اسلام اہل عرب کو حقیقت پسند بنانے اور اوہام سے آزاد کرانے کا تجربہ پیش کر چکا ہے۔ اسلام کچھ زیادہ آخرت پسند نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس اس نے اپنے پیرؤوں کو بہت مادیت پسند بنا کے دکھایا ہے

صدیقی صاحب کی نگاہ میں کمیونسٹ دہریت بہت زیادہ سائنٹفک اور عقلی ہے، نیز یہ مذہبی اعتقاد کی طرح لوگوں کو ایک تحریک دینے کے قابل بھی ہے۔ چنانچہ یہ اپنا کام کر رہی ہے۔ اسلام کو ایک

[1] صدیقی صاحب نے حدیث پر تو پہلے ہی ہاتھ صاف کر دیا تھا، یہاں آکر قرآن کا قلادہ بھی گردن سے اتار دیا۔

ازکار رفتہ تصور یا محض مابعد الطبیعیاتی معتقدات کا مجموعہ بنا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دہریت مسلمانوں کے ذہن کو کھینچ رہی ہے۔ اس کشمکش شتاشت سے نجات پانے کی شکل صدیقی صاحب یہ تجویز کرتے ہیں کہ اسلامی تصورات اور اس کے سیاسی ومعاشی نظام کی وسیع تر تعبیر نو کی جائے اور جامد مذہبی طبقات کو از سر نو تعلیم دی جائے۔ اس حل کو چھوڑ کر اگر اسلام کے سیاسی ومعاشی نظام ہونے کی حیثیت کا انکار کیا گیا تو وہ خلا پیدا ہوگا جسے بھرنے کے لیے فوراً کمیونزم لپکے گا۔ فرماتے ہیں کہ مسلم ممالک کے سامنے سیکولر جمہوریت اور کمیونزم میں ایک کے انتخاب کا سوال نہیں کمیونزم اور وسیع النظرف تصور اسلام میں سے ایک کو چن لینے کا سوال ہے۔

اب آپ ڈاکٹر فضل الرحمٰن لکچرر ڈرہم یونیورسٹی لنڈن (۲) کے خطاب بعنوان "اسلام میں جدید فکر" سے کچھ استفادہ کریں یہ خطاب ہمارے اندر نشوونما پانے والی تحریک جدیدیت (MUSLIM MODERNISM) کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تحریک کے اولین علمبردار کی حیثیت سے امام ابن تیمیہ کو پیش کیا ہے جن کے مکتب خیال نے وہابی تحریک کی صورت اختیار کی۔ اس کے بعد شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام آتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے سامنے جدید دور آجاتا ہے جبکہ مغرب اثر انداز ہونے لگا۔ اس دور میں سے وہ دو ائمہ جدیدیت کے نام پیش فرماتے ہیں۔ ایک سرسید احمد خاں دوسرے جسٹس امیر علی۔ سرسید کے متعلق بتایا ہے کہ وہ نہ صرف اہل فقہ کے روایاتی مدارس فکر کی، بلکہ مجموعی طور پر حدیث ہی کی اتھارٹی کے منکر تھے۔ جسٹس امیر علی کے بارے میں یہ رائے دی گئی ہے کہ انہوں نے اسلام کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ تمدنی ترقی اور سائنٹفک کلچر کا علمبردار بنا کر پیش کیا۔ پھر اجمالی تذکرہ جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کا کیا ہے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں جدید تصور اسلام کا پہلا فلسفی صحیح معنوں میں اقبال ہے۔ اس نے اپنے فلسفۂ عمل کی روح صوفی شعرا سے لی اور پھر اسے نطشائی اور برگسانی افکار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔

اسی ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے کام پر بھی ڈاکٹر صاحب نے اظہار رائے کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وقت کی ایک تحریک وہ ہے جسے ابوالاعلیٰ مودودی چلا رہے ہیں۔ اس کا جوہر مرکزی مغربی جمہوریت کو مسترد کر کے پاکستان کو ایک مذہبی حکومت میں بدلنا ہے۔ مودودی صاحب کا وسیع لٹریچر اور ترجمان القرآن نامی ماہنامہ بڑا منطقی زور رکھتا ہے لیکن اس کے اندر بعض بنیادی مغالطے شامل ہیں۔ نیز وہ اصلیت کے لحاظ سے منفی نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں ضرورت ایک ایسی تحریک کی ہے جو اسلام کو چند روحانی اقدار کا مخزن قرار دے کے چلے جن کے بل پر مستقبل کی ترقی عمل میں آسکے۔ مگر ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر بات ختم کرتے ہیں کہ عملاً ایسی تحریک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔